Journal of Urdu Literature and Indigenous Languages(Julil)
www.julil.org
editor@julil.org
Volume 4, Issue 2, (July to December 2025)
ISSN Online: 3005-978X
ISSN Print: 3005-9771

اُردو زبان کی واقعی مختصر ترین تاریخ: تعارف و تجزیہ

The Real Shortest History of Urdu Literature: An Introduction and Analysis

ڈاکٹر ماجد مشتاق
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

Dr. Majid Mushtaq
Assistant Professor, Department of Urdu, Govt. College University, Faisalabad

Abstract:
History of Urdu literature is one of the important trends in the research. American Language Authority (M.L.A) described in 1952 four important areas and the History of Literature is one of them. In Urdu literature there are so many writers made their contribution in this field. More than 40 books written in this area which shows significance of this field. Most surprisingly an important book of history written about the start of the Urdu language named "Urdu Zubaan ki Tarikh" by jomal waiz Lal ignored by the critics. This book was written in 1920 and one of the ancient work in this field. The writer made a vital contribution and a serious effort about the start of Urdu language in the Sub-Continent. The writer having research aptitude and writing style cannot be ignored anyway. This article is an effort to know about the history of the Urdu language, it's creation and the current situation of the Urdu language. This article will help the student of Urdu literature to know about the Jomal waiz Lal and his contribution in the field of history of Urdu literature.

Keywords: Jomal Waiz Lal, History, Sansikrat, Pehalvi, Amir Khusro, Meer Dard, Kabir Daas, British

اُردو زبان و ادب میں تاریخ تاریخ نویسی کی اہمیت سے انکار کسی طور ممکن نہیں وقت کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت میں اضافہ ہوتا گیا اور نامور محققین نے اس میں اپنی شبانہ روز محنت سے کارہائے نمایاں سرانجام دیا۔ تاریخ نویسی کا یہ شعبہ نہ صرف روزِ اوّل سے اہمیت کا حامل ہے بلکہ اس کی مبادیات میں بھی تنوع آتا جاتا ہے۔ تادمِ تحریر قریب قریب ۵۰ سے زیادہ تواریخ شائع ہو چکی ہیں اور ان تواریخ کا مطالعہ جس بنیادی امر کی طرف توجہ دلاتا ہے وہ یہی تنوع ہے۔ ہر موقف نے بطور مورخ اپنے اپنے ضابطے خود متعین کیے ہیں اور دوسرے مؤرخین سے انفرادیت کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر جمیل الدین عالی نے "اُردو کی ادبی تاریخیں" کے دیباچے میں اسی ارتقاء کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "ہاں ادب کی تاریخ کیا ہوتی ہے؟ یہ اپنی جگہ ایک علیحدہ بحث ہے۔ سمتوں اور معانی میں بڑے تنوع اور وسعتوں والی وقت کے ساتھ تاریخ کے مفہوم و تصور نے کئی سفر کیے بعض جاری ہیں۔"(۱)

ادبی تاریخ کے سلسلے میں آج بھی کوئی متعین اُصول اور ضابطہ ایسا نہیں جسے بنیادی سوال کی صورت مدِ نظر رکھا جائے، البتہ یہ مبنی بر حقیقت ہے کہ کسی بھی تاریخ کے مطالعہ کے وقت قاری کو مؤرخ کے تعین کردہ ادوار، عوام، اسباب اور ارتقاء کو ذہن میں رکھنا پڑتا ہے جس سے افادیت اہمیت برقرار رہتی ہے۔ اس حوالے سے احتشام حسین لکھتے ہیں:

> ''ایک سوال یہ ہو سکتا ہے کہ جب ادبی تاریخ میں زمانی تسلسل کا اتنا خیال رکھنا ضروری ہے اور اسباب و نتائج کے اتنے رشتوں کو پیش نظر رکھنا لازمی ہوتا ہے تو پھر اس کو مختلف ادوار اور حصوں اور دبستانوں میں کس طرح تقسیم کیا جائے کہ مطالعہ میں آسانی ہو۔ اس کا جواب بہت آسان نہیں لیکن عملاً ایسا کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہ تقسیم کبھی علاقہ یا مقام کی بنیاد، کبھی عہد اور زمانے کی بنیاد، پر کبھی افراد سے متعلق ہو جاتی ہے، کبھی تحریکات سے، کبھی اصناف کے نقطۂ نظر سے کی جاتی کبھی خیالات اور تصورات کے لحاظ سے۔''(۲)

ان بیانات سے یہ بات تو ظاہر ہے کہ اردو ناول، افسانہ، غزل، نظم کسی بھی صنف کے ارتقاء کا احاطہ ہو یا ادبی تحریکوں کے باب میں واقعات کو ایک لڑی میں پرویا گیا ہو تو اسے تاریخ نویسی کے ذیل میں ہی دیکھا جانا چاہیے، مگر عمومی رویہ اس کے برعکس ہے۔ ہمارے ہاں تاریخ نویسی کے حوالے سے اردو زبان کے ارتقاء کے بنیادی تحقیقی سوال پر لکھی جانے والی تاریخیں ہی تاریخ نویسی کا عملی نمونہ سمجھی جاتی ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اردو دانوں نے ہمیشہ بیرونی اثرات قبول کیے اور بغیر لیت و لعل نہ صرف قبول کیے بلکہ من و عن ان پر عمل بھی اپنا ازلی و ابدی فریضہ سمجھا۔ اس حوالے سے (.M.L.A)'امریکن ماڈرن لینگویج اتھارٹی' کی تحقیقی کارروائی کمیٹی نے ۱۹۵۲ء میں ایک رپورٹ پیش کی ہے۔ اس حوالے سے گیان چند جین لکھتے ہیں:

> ''اس میں چار موضوعات تھے۔ ۱۹۶۲ء میں ان موضوعات پر دوسرے لوگوں سے نئے تنقیدی مضامین لکھوائے گئے جس میں پچھلے دس سالوں کی فکری و نظری ارتقا سے فائدہ اٹھایا گیا۔ کہا گیا کہ علمیت یا دانشوری کے یہی چار شعبے ہیں: ۱۔ لسانیات، ۲۔ متنی تنقید (تدوینِ متن)، ۳۔ ادبی تاریخ، ۴۔ ادبی تنقید۔ انگریزی میں تاریخ ادب کہنے کی بجائے ادبی تاریخ کی اصطلاح کا رواج ہے۔''(۳)

اس صورتِ حال میں ہمارے ہاں بھی تاریخ نویسی کے ذیل میں ادبی تاریخ کو اپنی اولین ذمہ داری سمجھ کر اس پر زور و شور سے کام ہونے لگا اور کئی قابلِ قدر نمونے سامنے آنے لگے۔ اب تک ایسے بڑے بڑے نام بطور ادبی مؤرخ اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ گیان چند جین نے بڑی صراحت کے ساتھ ''اُردو کی ادبی تاریخیں'' کے عنوان سے کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب میں لگ بھگ ۴۱ تاریخوں پر سیر حاصل گفتگو میسر آتی ہے۔ البتہ ان کا اپنا معیار ہے کہ وہ کئی تاریخوں کو جزوی اور نامکمل کہہ کر اس منصوبے میں شامل نہیں کیا گیا۔ انھیں نظر انداز کرنے کی جانے والی تاریخوں میں سے ایک تاریخ ''اردو زبان کی تاریخ'' جو جومل واعظ لال کی تحریر کردہ ہے جو اس وقت زیرِ بحث ہے۔ گیان چند جین نے اپنے دیباچہ میں جن تاریخوں کی اہمیت دی اور اس سے پہلے جو اصول وضع کیے ان میں بُعد نظر آتا ہے۔ نامکمل تعریفوں کا ذکر کرتے ہیں اور ان سے صرفِ نظر کی بات کرتے ہیں اور پھر ڈاکٹر تبسم کاشمیری اور ڈاکٹر جمیل

جالبی کی تاریخوں کو حد درجہ اہمیت دیتے ہیں جو اس وقت مکمل نہیں تھیں اور اس کا تذکرہ بھی کیا، پھر اسی طرح بعض تاریخوں کی طوالت پر اعتراضات اٹھاتے ہیں اور فہرست میں بے جا طویل تاریخوں کا ذکر اور تجزیے میں تعریفیں نظر آتی ہیں۔ یہ اعتراض کس حد تک بجا یا بے جا ہے یہ الگ بحث ہے۔ کسی بھی کام کو بحث سے خارج کرنے کا جواز مشکل فیصلہ ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر سلیم اختر کی کتابوں کی طوالت اور ڈاکٹر تبسم کاشمیری اور انور سدید کا اسلوب، محمد حسین آزاد، عبدالقادر سروری اور ملک حسن اختر کی تاریخوں میں درج دعوے آج بھی ناقدین کے موضوعات ہیں۔ اس بحث سے بس یہ مقصود ہے کہ ۱۹۲۰ء میں شائع شدہ تاریخ جو واقعی مختصر ہے اور عہد باعہد موضوعات پر نظر نہیں رکھتی ہے۔ اسے یکسر نظر انداز کر دینا بالکل بھی حق بجانب دکھائی نہیں۔

اس تاریخ کی دو بڑی خوبیاں نظر آتی ہیں، ایک تو یہ کہ جو مل واعظ لال نے عہد بہ عہد اُردو کی تاریخ کو تاریخی نقطہ نظر سے اس طرح پیش کیا ہے کہ اس میں خلا کی صورت دکھائی نہیں دیتی اور دوسرا وصف اس کا اختصار ہے۔ ادھر ادھر کی باتوں اور قیافوں پر بھروسہ کرنے کی بجائے حقائق پیش کیے ہیں جس سے تشکیک کی بجائے حتمی انداز نظر آتا ہے۔ جو مل واعظ لال کا زبانوں کے حوالے سے تصنیفی سرمایہ، ان کی تاریخ دانی، دونوں ہی سے ان دونوں ہی سے ان کے شوق اور ذوق کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ اس کا ثبوت اردو زبان کی تاریخ کے مسودے میں پرنٹرز کی طرف اشتہار نما معلومات سے ان کی مزید دو کتابوں کا ذکر ملتا ہے، جن میں ''عربی ادب کی تاریخ'' اور ''فارسی ادب کی تاریخ'' شامل ہیں۔(۴) اس طرح یہ بات تو واضح ہے کہ محض نقاد یا نقاد ہونے کا دعویٰ رکھتے ہوئے لسانی ادبی تاریخ لکھنے والوں کا احوال قیافوں، اندازوں اور ایسے ہی مختلف حربوں پر مشتمل ہے۔ جو مل واعظ لال کی کتاب ان قیافوں سے بالکل آزاد ہے۔ جو مل واعظ لال اردو زبان کی تاریخ بیک وقت تاریخ اور ارتقا دونوں کو موضوع بناتی ہے۔ انھوں نے اس کتاب کا پہلا باب ''اردو زبان کے ماخذ'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ اس باب میں ایک ماہر محقق کی طرح گفتگو کا آغاز تحقیقی سوالات سے ہوتا ہے۔ اس حوالے سے تحریر کرتے ہیں:

> ''اب ہم اس بات کو دریافت کریں کہ اردو زبان کہاں سے نکلی اور کس طرح اس کا دور شروع ہوا۔''(۵)

ان سوالوں کا جواب تلاش کرنے کے لئے جو مل واعظ لال نے ہندوستان کی قدیم ترین تاریخ اور ہندوستان کی آبادکاری سے مختلف نسلوں کے گروہوں کی آبادکاری کا تذکرہ کیا ہے۔ ان مختلف النوع انسانوں کی آبادکاری اور زبانوں کے اشتراکات سے نئی زبان کا آغاز ایک فطری عمل نظر آتا ہے۔ ہندوستان میں ایرانی، لاطینی، یونانی، جرمن اور فرانسیسیوں کی یہاں آبادکاری اور مقامی ایرین لوگوں کے باہمی تعلقات سے نئی زبان کا جنم وقت کی ضرورت بھی تھی اور سماجی زندگی کا اہم حصہ بھی۔ مصنف نے مختلف زبانوں کے الفاظ کے جدول پیش کرتے ہوئے ان اشتراکات کا ذکر بھی کیا ہے۔ مصنف نے اس باب میں ایرانی اور مقامی لوگوں کے باہمی سماجی تعلقات کے ذریعے اردو زبان کے آغاز کو مذہبی کتابوں اور ان کی زبان سے جوڑا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''قدیم ایرانیوں کی زبان کا پتا ان کی مقدس کتاب ''ژند'' سے ملتا ہے۔ ژند اور ویدوں کی زبانیں بہت ملتی ہیں اور صدہا الفاظ تو بعینہٖ یکساں ہیں۔ عبارت کی ترکیب اور بندش بھی دونوں میں بہت حد تک ایک ہی طرح کے ہیں۔''(۶)

یہاں یہ بات تو صاف ظاہر ہے کہ اردو زبان کی ابتدا کے مقبول نظریات میں جس مقدمے کو بنیاد بنایا گیا وہاں یہی مماثلتیں بروئے کار لائی گئیں۔ ''پنجاب میں اردو''، ''سندھ میں اردو'' جیسے معروف نظریات بھی اسی پیرائے پر استوار کیے گئے۔ مصنف کا وصف ہے کہ وہ زبان اور رائج زبانوں کی موجودہ صورتِ حال کی بجائے تاریخی حوالوں پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں۔

جومل واعظ لال نے دوسرے باب میں اسی سفر کو آگے بڑھا کر ایرانیوں اور دراوڑیوں کے باہمی اشتراک کو اردو کی جنم کے حوالے سے اہمیت دی ہے۔ ان کے نزدیک کوہ ہمالیہ سے لے کر کوہ وندھیاچل اور یہاں سے مغرب میں گنگا جمنا کے سنگم تک رسائی کی مگر ایرین نسل کے ان لوگوں کا مختلف صوبوں تک پہنچنا ان کے لیے دو طرح کے مسائل لایا۔ پہلا مسئلہ تو یہ تھا کہ وہ اپنے ساتھ عورتوں کی بہت کم تعداد لائے اور انھیں یہاں کی مقامی عورتوں سے شادی کرنا پڑی۔ یوں ایرینز اور دراوڑی عورتوں کے ملاپ سے، جہاں سماج میں تبدیلیاں آئیں وہیں زبان کے اثرات بھی قبول کیے جانا شروع ہو گئے اور دوسرا یہ کہ ایرین یہاں فتح یاب ہوئے تو یہاں کے دراوڑی لوگوں کے ساتھ بطور محکوم ان کا رویہ ان کی زبان سمجھنے اور اس کو اپنانے تک بھی پھیلتا چلا گیا۔ یوں اس دوسرے باب میں یہاں کی موجود بولیاں جنھیں پراکرت کہا جاتا تھا وہاں تک کا سفر طے کیا گیا ہے۔ ان کے نزدیک یہاں کی چار خاص پراکرتیں، پشاچی، مہاراشٹری، مگدھی اور شورسینی ہیں۔ زبان کا یہ سفر ایرانیوں سے لے کر دراوڑی اور ایرین سے ہوتا ہوا شنکر اچاریہ کے دور تک پہنچا، جس میں ۸ سو سنِ عیسوی سے ہزار سن عیسوی تک تیسری پراکرت کا زمانہ بھی شامل ہو گیا۔ یوں اردو زبان جو دلی کے گرد بولی جانے والی 'برج بھاشا' سے مطابقت رکھتی تھی اس کا اصل ماخذ شورسینی تھا۔ یہی مقدمہ مولانا محمد حسین آزاد نے بھی قائم کیا اور اردو کو برج بھاشا کی بیٹی قرار دیا۔ یہاں جومل واعظ لال نے اسے برج بھاشا تک محدود نہیں رکھا بلکہ سلسلہ وار آگے بڑھاتے ہوئے یہاں کی چاروں پراکرتوں کے مختلف زمانے اور ان کے علاقوں تک پھیلایا ہے۔ تیسرا باب ''ملک ہند میں مسلمانوں کا دخل'' کے عنوان سے درج کیا گیا اور یہاں مسلمانوں کی آمد کے بعد مختلف ادوار میں مسلمانوں کے حملے اور ان کی حکومتوں میں پھیلتی ہوئی زبانوں اور زبانوں کے تنوعات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس حوالے سے جومل واعظ لال کا کہنا یہ ہے کہ محمد بن قاسم سے محمود غزنوی تک تو زمانے نے اتنی کروٹ نہیں لی کیونکہ ان میں سے اکثر لوگ یہاں قلیل عرصہ رہے اور واپسی کا سفر کیا۔

اس قلیل عرصے میں زبانوں پر اثرات تو ہوئے مگر اصل اثرات سلطان محمد غوری کے بعد جب ۱۲۰۶ء میں ہندوستان میں مسلمانوں کی پہلی ریاست کے قیام کے بعد شروع ہوئے۔ جومل واعظ لال کے نزدیک مغلوں کا عہد، ابراہیم لودھی کی شکست کے بعد اردو کے فروغ کے زمانے میں اہمیت کا حامل رہا۔ جومل واعظ لال نے چوتھا باب ''مسلمان بادشاہوں کی زبان'' کے نام سے تحریر کیا ہے۔ اس کا سلسلہ بھی وہ قدیم ہندوستان سے لے کر آگے بڑھتے ہیں۔ ان کے نزدیک جب ایران پر ایرینز نے قبضہ کر لیا تو اس سے ان کی مذہبی کتاب ''ژند'' کہ زیادہ تر الفاظ اور سنسکرت میں کافی زیادہ مماثلت پائی جاتی تھی۔ ''ژند'' کیونکہ مذہبی کتاب بھی تھی اس لیے اس کی زبان اور سنسکرت کے الفاظ میں مماثلت کی وجہ سے یہاں کے لوگوں میں ایک نئی زبان کی طرف سفر شروع ہوا۔ سکندر اعظم نے جب ایران پر فتح حاصل کی تو انھوں نے اس قوم کو سماجی، مذہبی، نظریاتی اور لسانی حوالے سے بھی خوب متاثر کیا اور یہاں جو نئی زبان وجود میں آئی اس کا نام 'پہلوی' تھا۔ یہ زبان بلاشبہ یونانیوں کے زیرِ اثر یہاں کی مقامی زبانوں کے ساتھ مل کر وجود میں آئی تھی۔ ایرانیوں کی زبان اور اس پر عربوں کے قبضے کی صورتِ حال کے بارے میں جومل واعظ لال لکھتے ہیں:

> ''بڑا خوف یہ تھا کہ جس طرح اسلام نے ایران کے پرانے مذہب کو وہاں سے
> اڑایا عربی زبان بھی 'پہلوی' کا نام و نشان مٹائے لیکن ایرانیوں نے مذہب تو بدلا

پر اپنی پرانی زبان نہیں بدلی۔ عربی زبان زور اور فصاحت سے بھری ہے اور
ایرانیوں نے بڑے شوق سے اسے سیکھا مگر اپنی مادری زبان بھی نہیں چھوڑی
بلکہ عربی کے لفظوں کو بڑی خوبی کے ساتھ اپنی زبان میں نگینے کی طرح جڑ دیا
۔عربی لفظوں کے داخل ہونے سے پہلوی میں بڑا لطف اور سہانا رنگ پیدا ہو گیا
اور اسی ملی جلی، لطیف اور رنگین زبان کو فارسی کہتے ہیں۔"(۷)

جومل واعظ لال نے اسی مقدمے کو ہندوستان پر لاگو کیا اور یہ کہا کہ ایرانیوں میں سے بہت سارے لوگ جو ایران سے مذہب بدلنے کے ڈر سے ہندوستان اور افغانستان کے علاقوں میں آباد ہوئے تو وہاں وہ اپنے ساتھ فارسی بھی لائے۔ دوسری صورت یہ ہوئی کہ ہندوستان پر بلبن اور محمود و سنجر جیسے بادشاہ آموجود ہوئے، جنھوں نے اردو شاعری کو بہت جلا بخشی، لہٰذا یہ سلسلہ سرکاری سرپرستی میں بڑھتا چلا گیا اور جب ہندوستان پر افغانستان سے حملہ ہوا تو وہاں سے وہ زبان جو پہلوی سے فارسی میں بدلی تھی وہ بھی ساتھ آئی۔ لہٰذا اب اردو کا یہ روپ جو ۱۲ویں صدی عیسوی تک تھا وہ پراکرتوں سے نکل کر عربی اور فارسی کے زیرِ اثر ایک نئی زبان کی صورت وجود میں آیا۔

جومل واعظ لال نے پانچواں باب "ہندی پر عربی فارسی زبانوں کے اثرات" کے عنوان سے تحریر کیا ہے اور اس کا سلسلہ بھی انھوں نے مسلمان فاتحین کے ساتھ جوڑا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ سکندر لودھی، اکبر بادشاہ، ہمایوں اور ان کے جانشینوں کے حوالے سے اس عہد کے علماء و فضلا کا بھی ذکر کرتے ہیں جن میں فیضی، مرزا مظہر جانِ جاناں جیسے لوگ بھی شامل ہیں۔ اسی طرح اکبر کے نورتنوں کا ذکر بھی خاصیت سے ملتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ افغان اور مغل بادشاہوں کے آنے کے بعد یہاں کے رسوم و رواج، دستور، دین، علوم و فنون، حکمت و حکومت پر سب کے اثرات کا جائزہ لیتے لیتے فارسی اور بھاشا کی جو ملاوٹ تھی اس کا مقدمہ قائم کرتے ہیں اور یہاں کی مقامی پراکرتوں کا اس میں سلسلہ جاری کرتے ہیں۔ چھٹے باب میں انھوں نے اپنے مقدمے کو سمیٹتے ہوئے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ اردو کسی ایک زبان سے مل کر نہیں بنی بلکہ یہ چار زبانوں سے مل کر بنی ہے اور ان چار زبانوں میں وہ سنسکرت، دراوڑی، فارسی اور عربی کو شامل کرتے ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ ترکی، فرانسیسی، انگریزی یا فرنگیوں کی زبان کے ایسے بہت سارے الفاظ جو ہمارے ہاں شامل ہو گئے ہیں، انھیں کسی طور اردو کا ماخذ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ان کے نزدیک یہاں کی پراکرتیں جو سنسکرت میں ڈھل گئیں، سنسکرت، دراوڑی جو بہت قدیم زبانیں تھیں، پھر فاتحین کے زیرِ اثر عربی اور فارسی کی آمد کے بعد جو نئی زبان پیدا ہوئی اس کو 'ریختہ' کا نام دیا گیا جس کے معنی ہی گری پڑی چیز کے تھے۔ ترکی میں اسے بازار یا فوجی بازار کا نام دیا گیا تو فوجی بازار کی نسبت سے مغلوں کی بڑھتی ہوئی پیش قدمی سے تعبیر کیا ہے۔ جیسے جیسے مغل مختلف علاقوں میں پیش قدمی کرتے رہے تو یہاں کی مقامی زبانوں کے الفاظ بھی شامل ہوتے گئے۔ اس طرح سے جومل واعظ لال کے بعد جو دعویٰ حافظ محمود شیرانی صاحب کا "پنجاب میں اُردو" میں نظر آتا ہے وہ پھیکا پڑتا دکھائی دیتا ہے کیونکہ یہاں کے مقامی زبانوں کے حوالے سے عربی، فارسی، مغلوں، پٹھانوں وغیرہ کی آمد کے ساتھ مدلل انداز میں جومل واعظ لال نے اپنا مقدمہ قائم کیا ہے۔

ساتویں باب میں جومل واعظ لال نے ۱۹۲۰ء میں یہ دعویٰ کیا کہ اردو زبان کی عمر ۹۰۰ برس ہے اور اسے تاریخ سے درست ثابت کرنے کے لیے انھوں نے شورسینی، پراکرت کی بیٹی کے طور پر پیش کیا۔ اس کے بعد متھرا، آگرا، اجمیر میں اس بھاشا کا رواج، پنجاب میں راجہ جے پال کو شکست اور مغلوں کی یہاں عمل داری کو بھی اسی انداز میں پیش کیا ہے۔ محمود غزنوی کے زمانے کو وہ قتل و

غارت کا زمانہ قرار دیتے ہیں اور ان کے ڈر سے یہاں پھیلتے ہوئے اثرات کو بھی اہم مانتے ہیں مگر محمد غوری کے زمانے کے بعد فارسی کا اثر زیادہ دکھاتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ اس عہد کے ایک شاعر 'چند بردائی' کا ذکر کرتے ہیں جس نے ہندی میں ایک نظم لکھی جو تین موٹی موٹی جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے کوئی ستر حصے ہیں جس میں راج کا سارا احوال بیان کیا گیا ہے۔ زبان کی ابتدا کے حوالے سے ان کا ماخذ یہی کتاب نظر آتی ہے۔ وہ اردو کے رواج کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''اردو زبان کا بیج گیارہویں اور بارہویں صدیوں میں پھوٹا اور قطب الدین ایبک کے زمانے تک چھوٹی چھوٹی نرم اور نازک پتیاں بھی نکل آئیں، چونکہ ابھی تھوڑے ہی سے فارسی اور عربی لفظ ہندی میں داخل ہوئے تھے اس لیے ہندی کا اصل رنگ تبدیل نہیں ہوا، پر اتنا تو ضرور ہوا کہ اردو کی بنیاد پڑ گئی۔ اب ذرا تھوڑے سے نمونے دیکھ لیجئے ایک موقع پر چند بردائی کہتا ہے۔ مصرع: صاحب سلام سب کری آئے یعنی صاحب سلامت کر آئے پھر جب پرتھی راج پدماوتی کو لے کر قنوج سے بھاگا تو اس کا بیان چند بردائی نے یوں کیا:

بھئی خبر نگر باہر سنائے پدماوتی ہری لیے جائے''(۸)

انھوں نے چند بردائی اور پدماوتی کے حوالے سے کہانیوں میں لکھی گئی نظموں کا ذکر کیا اور پھر یہاں کا سلسلہ کبیر داس سے جوڑا۔ کبیر داس کے ہاں اردو کے الفاظ کا ذکر جن میں تیل، گھائل، گھاؤ جیسے لفظ بھی شامل ہیں اور پھر آگے سلسلہ بڑھتے بڑھتےّ پر تھوی راج راسو تک آ پہنچا جس کو پڑھ کر معلوم ہوا کہ جیسے اس وقت تک اردو کے بہت سارے اسم یہاں کی مقامی زبانوں سے وجود پا چکے تھے۔ جیسے دن، رات، پھول، دیپک، مالا، راج وغیرہ۔ جو مل واعظ لال نے ان اسماء اور افعال کی ایک لمبی فہرست پیش کی ہے جو عربی اور فارسی کے زیرِ اثر ہندی میں رائج ہو چکے تھے۔ لہٰذا ابتدائی زبان کی اردو اور ہندی میں زیادہ فرق معلوم نہیں ہوتا مگر جو مل واعظ لال کا یہ دعویٰ کہ اردو کی بنیاد پڑ چکی تھی، اس زمانے میں اردو کی پرداخت کے حوالے سے اہمیت اختیار کرتا نظر آتا ہے۔ مصنف نے اس کے بعد باب میں ۱۲۰۶ء سے ۱۵۲۶ء عیسوی کے زمانے کا ذکر کیا ہے جسے وہ 'پرانی اردو کا زمانہ' قرار دیتے ہیں۔ اس حوالے سے شاعر امیر خسرو جو ترکی خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور پٹیالی میں پیدا ہوا، یہ قصبہ پٹیالی پہلے مومن آباد کے نام سے مشہور تھا، امیر خسرو جوانی میں دلی آ کر آباد ہوا۔ بلبن اور تغلق کے تخت کے زمانے میں نظام الدین اولیاء کی شہرت اور ان سے خسرو کی شاگردی اور عقیدت مندی کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے خسرو کا مشہور زمانہ شعر پیش کیا:

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈالے کیش
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چھوں ویش(۹)

اس باب میں ان کا مرکز خسرو اور ان کی پہیلیاں ہیں۔ ان پہیلیوں میں اردو اور ہندی کے الفاظ اور ہندی کلام کا نمونہ پیش کرتے ہوئے انھوں نے اردو کی ابتدا کے حوالے سے انھیں اہم ترین شاعر کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اس کے بعد وہ خالق باری کا تذکرہ کرتے ہیں جس میں عربی بحروں کا استعمال کیا اور عربی اور فارسی الفاظ کو خوبصورتی سے برتا گیا ہے۔ یہ اس دور کے نمایاں ترین نمونے ہیں۔ اس کے بعد ان کا موضوع کبیر داس ہیں جن کے دوہے اور بھجن ہندی زبان میں ہیں مگر اس میں اردو کے آثار بخوبی نظر آتے ہیں۔ اس حوالے سے اُردو کے نمونے میں چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تم رہنا خوب ہوشیار
نگر میں چور جو آوے گا

تفنگ، تیر، تلوار نہ برچھی
نہ بندوق چلاوے گا
بھیت نہ چھوڑے اور نہ
پھاندے
نہ کومل لگاوے گا
ایک فریاد چلے نہ تیری
ایسا لشکر آوے گا(۱۰)

جومل واعظ لال نے "نئی اردو کا زمانہ ۱۵۲۶ء سے لے کر زمانہ حال تک" کے نام سے نواں باب تشکیل دیا ہے۔ ان کے خیال میں مغل بادشاہوں کا دور زرّیں اردو کا دور ہے، جس میں سنسکرت کی کتابوں کا ترجمہ فارسی میں کیا گیا۔ اس کے علاوہ ہندو شہزادیاں اردو بھاشا بول رہی ہیں۔ دربار میں ہندو مشیر، وزیر، بادشاہ یہ بھاشا بول رہے ہیں۔ علمی مجلسیں ہو رہی ہیں۔ نئی اردو کی ترقی کے حوالے سے دلی اس کا مرکز رہا۔ صرف یہی نہیں بلکہ بعد میں آنے والے لوگوں میں بالخصوص شاہ ولی اللہ اور ان کی اولاد کے حوالے سے لکھی گئی کتابوں کو فارسی کے تراجم کے حوالے سے خصوصی اہمیت دی ہے۔ اس باب میں انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو نام اور چیزیں یہاں کی زبان میں آئیں ان میں جُبا، کُرتا، لبادہ، قبا، آستین وغیرہ کی مثالیں دی ہیں۔ اسی طرح کھانے، تہوار، برتن ایک لمبی فہرست ہے جو عربی اور فارسی سے یہاں استعمال میں آئی۔ اسی طرح عربی اور فارسی کے اسماء کے ساتھ اسم فاعل اور ہندی میں مصادرِ مفرد اور مصدر جو بعد میں اردو میں زیر استعمال آئے، ان کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے ہندی والوں کے حوالے سے یہ ذکر بھی کیا کہ عربی اور فارسی کے بہت سارے اسماء، صرف و نحو کے قاعدے، عربی اور فارسی کی تراکیب بھی استعمال کیں اور یہاں ایک نئی زبان وجود میں آئی۔ اس باب میں وہ سورداس جی کے بھجن کا تذکرہ بھی اسی زبان کے ذیل میں کرتے ہیں۔ بعد ازاں تلسی داس جی کا ذکر کرتے ہوئے یہاں سے سلسلہ اکبر بادشاہ کے دور تک آتا ہے، جہاں موجودہ دور کی اُردو ایک شستہ اور صاف زبان کی صورت میں نظر آتی ہے۔ اس باب میں سورداس جی اور تلسی داس کے بھجنوں کا ذکر بھی ملتا ہے جسے انھوں نے اردو کے عروج سے تشبیہ دی ہے کیونکہ یہاں اردو نام کا لفظ اس زبان کے حوالے سے رائج نہیں تھا تو وہاں کے لوگوں کے حوالے سے ان کا دعویٰ ہے کہ لوگ اس زبان کو ہندی ہی کہتے رہے جب کہ اس سے پہلے جومل واعظ لال اردو کے بیج پہلے سے بونے اور اس میں سے کونپلیں نکلنے کا ذکر کرتے ہیں۔

دسواں باب "نئی اردو نظم کا زمانہ" ہے جسے عہد بہ عہد انھوں نے پیش کیا ہے۔ اس باب میں جومل واعظ نے ابتدائی نقوش میں چند برد ائی، امیر خسرو، کبیر جی کے کلام کا ذکر کیا ہے جو ہندی اور اردو میں فرق کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد فارسی نظم کے جامہ میں لکھی گئی نظموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے وہ بیان کرتے ہیں:

"یہاں یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ نظم ہی سے پہلے اردو کی ابتدا ہوئی ۔اس سے پہلے اردو کی کوئی خاص قدر نہ تھی بلکہ اسے گری پڑی چیز کے برابر سمجھتے تھے۔ غالباً اسی سبب سے اردو نظم کو شروع میں 'ریختہ' نام دیا کیونکہ ریختہ کہ معانی گرے پڑے کے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ریختہ نام اس لیے دیا گیا کہ

اس میں الگ الگ زبانوں کے لفظ پڑے ہوئے ہیں۔ بہر حال اسی ریختہ کے نام
سے پہلے پہل اردو نظم مشہور ہوئی۔"(۱۱)

مصنف نے اردو نظم کی ابتدا کے حوالے سے ابو الحسن قطب شاہ کے بیٹے کا ذکر کیا جن کے اتالیق شجاع الدین نوری جو گولکنڈہ کے بادشاہ کے قریبی لوگوں میں سمجھے جاتے تھے اور اکبر کے مشہور درباری شاعر فیضی کے دوست تھے ان کو اردو کے ابتدائی نقوش میں شامل کیا ہے اور یوں دعویٰ کیا ہے کہ اردو نظم کی کل عمر ساڑھے تین سو برس کی ہے۔ اردو نظم کی لمبی چوڑی تاریخ کو انھوں نے سعد اللہ گلشن، اورنگزیب عالمگیر کے زمانے کے بعد ولی دکنی سے جوڑا اور ولی دکنی کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے عربی، فارسی اور ان کی اصطلاحوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ یہاں ولی کے محاورے، تشبیہوں کا ذکر کرتے ہیں اور ولی کے املائی نظام کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ اس حصے میں انھوں نے ولی کے نمونہ کلام سے بھی ان کی غزلیں پیش کی ہیں اور وہ اسے اردو کا صحیح معنوں میں موجد اور ابتدائی نمونہ قرار دیتے ہیں۔ اس کے بعد سودا، میر تقی، مرزا جانِ جاناں، خواجہ میر درد کا ذکر آتا ہے۔ جو مل واعظ کے نزدیک ان لوگوں نے اردو کو وہ روپ دیا جو قابلِ ستائش ہے۔ ان کے بعد ناسخ، انیس، دبیر کا تذکرہ کرتے ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ شاہ جہاں، اورنگزیب کی اولاد کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ اٹھارہویں صدی کے آخر میں شاہ عالم ثانی، دہلی کا بطور شاعر تعارف بھی کرواتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ رقم طراز ہیں:

"اٹھارہویں صدی کے آخر میں شاہ عالم ثانی، دلی کا بادشاہ ہوا۔ یہ خود بھی شاعر
تھا اور آفتاب اس کا تخلص تھا۔ اس بادشاہ نے اردو نظم میں چار دیوان تصنیف
کیے، خدا کی شان دیکھو شاہجہان، اورنگزیب کی اولاد کو اردو شاعری میں نام
حاصل کرنے کا شوق ہوا۔"(۱۲)

مصنف کا دعویٰ ہے کہ یہی وہ دور تھا جس میں عربی اور فارسی محاورے کے زیر تحت اردو سب کی نظروں کا تارا ہو گئی۔ پھر اسی باب میں میر تقی میر، مرزا جان جاناں، میر درد کے شعری نمونے پیش کیے گئے ہیں جس سے یہ بات واضح معلوم ہوتی ہے کہ انیسویں صدی کا زمانہ اردو کے عروج کا زمانہ تھا، جس کی بنیاد اٹھارہویں صدی میں رکھ دی گئی تھی۔ مصنف کے الفاظ سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ وہ اردو نظم کے عروج کے زمانے کو میر، سودا، جان جاناں، میر درد اور ان کے متاخرین کے ساتھ جوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

گیارہواں باب "نئی اردو نثر کی ابتدا اور ترقی" کے عنوان سے ہے جس میں نظم کی طرز پر ہی نثر کا احوال دیا گیا ہے۔ اس حوالے سے وہ مختلف مثالوں کے ذریعے سے نثر کا فارسی کے زیرِ اثر ہونا ثابت کرتے ہیں۔ اردو کی نثر کے حوالے سے جو علمی نمونے ان کے سامنے ہیں ان میں میر محمد عطا حسین خان تحسین کی نو طرز مرصع کا ذکر کرتے ہیں جو ۱۷۹۸ء میں، امیر خسرو کی مشہور فارسی کتاب "چہار درویش" کا ترجمہ کی صورت میں سامنے آئی۔ یہ غالباً اردو کی پہلی تصنیف تھی اس کا نام "نو طرزِ مرصع" رکھا گیا۔ ۱۷۹۹ء میں میر شیر علی افسوس نے "باغ و بہار" اردو میں لکھی۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں اردو نے زور دکھایا اور یہاں سے پھر حیدر بخش حیدری، میر امن لطف دہلوی، میر بہادر علی حسینی جیسے لوگوں نے نثر میں نمایاں کارنامے سرانجام دیے۔ ان کی مشہور کتابوں میں "اخلاقِ ہندی"، "نثر بے نظیر"، میر امن کی "باغ و بہار"، حیدر بخش حیدری کی "توتا کہانی"، "آرائشِ محفل" کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ بعد کے دور میں عبد الحلیم شرر، نہال چند لاہوری، ڈپٹی نذیر احمد جیسے ناول نگاروں کا ذکر کیا گیا اور ڈرامے کے حوالے سے کاظم علی جوان

کے اردو میں ''شکنتلا'' ناٹک اور ''دستورِ ہند'' کا تذکرہ شامل ہے۔ یہاں انھوں نے نمونوں کے ساتھ اردو کی قدر و قیمت کو واضح کیا ہے۔ صرف یہی نہیں جو مل واعظ لال نے بخوبی طور پر فورٹ ولیم کالج کا ذکر کیا اور فورٹ ولیم کالج کے ساتھ ساتھ اس کی خدمات کا اعتراف بھی کیا ہے۔ اس دور میں ذوق اور غالب کے زمانے میں فارسی اور عربی لفظ جو اردو میں بہت استعمال ہوتے تھے ان کے عالمانہ اور رنگین سانچے کو بھی پیش کیا ہے۔ فارسی اور عربی محاورے کے ساتھ نثر کا ذکر کیا گیا ہے جس کی لطافت اور رنگینی کا اعتراف بھی کیا گیا۔ عہد بہ عہد تاریخ کو آگے بڑھاتے ہوئے جو مل واعظ لال نے اپنی تاریخ کا آخری باب ''اردو میں انگریزی کا دخل اس کے فائدے اور نقصان'' کا احاطہ کیا ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس تاریخ میں جو مل واعظ لال نے ان عنوانات کو متصل انداز میں پرانی بحثوں کے ساتھ جوڑتے ہوئے آئندہ کے لیے پیش کیا۔ انھوں نے ی پراکرت، سنسکرت، دراوڑی، ایرین زبانوں کا ذکر کیا، عربی اور فارسی کے تصرف کا ذکر کیا اور بحث کرتے کرتے اس انداز میں لائے کہ انگریزوں کے عمل دخل کے بعد اس میں فرنگی زبان کے بہت سارے الفاظ بھی شامل ہو گئے۔ ان کے نزدیک یہ زبان کی زرخیزی ہے کہ وہ اپنے اندر ان چیزوں کو سمو لیتی ہے۔ مصنف یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ ڈپٹی نذیر احمد، شرر جیسے مصنفین کے ہاں انگریزی الفاظ بہت کم ہیں مگر آہستہ آہستہ ان کا چلن ہمارے ہاں زیادہ ہو گیا ہے۔ وہ موجودہ (یعنی ۱۹۲۰ء کے) زمانے تک اردو کو اسلامی جاہ و جلال، شان و شوکت، عظمت و حشمت کی ایک زندہ یادگار کے طور پر پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ لسانی حوالے سے اس کی اہمیت کو مسلسل سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک انگریزی کا یہ عمل دخل اردو کے لیے کسی طور نقصان دہ نہیں البتہ ان کا بے دریغ استعمال اس کے فطری حسن کو متاثر کرنے کے لیے کافی دکھائی دیتا ہے جس سے بہر طور اجتناب کیا جانا چاہیے۔

مجموعی طور پر یہ تاریخ کئی حوالوں سے اہمیت کی حامل ہے۔ اولاً تاریخ میں عہد بہ عہد جس طرح سے زبان کے ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے شاید ہی کسی اور تاریخ میں عہد بہ عہد ترویج و ترقی کو اس طرح شامل کیا گیا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ مصنف کا یہ دعویٰ کہ اردو زبان کسی ایک زبان کی بیٹی نہیں یہ بھی درست معلوم ہوتا ہے اور انھوں نے بڑے محققانہ انداز میں عربی، فارسی، دراوڑی، ایرینز، قدیم فارسی یعنی پہلوی کا ذکر بھی کیا ہے۔ عہد بہ عہد ترکی، انگریزی اور دیگر زبانوں کے اردو میں دخیل الفاظ کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ اردو زبان کے فروغ اور اس کی اس شکل تک آتے آتے ان کا مقدمہ، اسماء، افعال اور مصادر پر محیط ہے۔ اگر یہ تاریخ حافظ محمود شیرانی کی نظر سے گزری ہے تو عین ممکن ہے کہ جو مل واعظ لال کے اس انداز کو حافظ محمود شیرانی نے سامنے رکھا ہو اور ۱۹۲۸ء میں اپنے نظریے کی بنیاد بنایا ہو۔ اس تاریخ کی ایک اور اہمیت بھی ہے وہ یہ کہ انھوں نے ستائش یا استحسان کے پہلوؤں کو ایک طرف رکھتے ہوئے تاریخی انداز میں اولیت کی بحث کی ہے، بالخصوص وہ لوگ جن میں چند بردائی، تلسی داس، کبیر داس جیسے لوگ شامل ہیں جنھیں اردو کے مؤرخین نے کبھی اردو کا شاعر نہیں مانا، ان کی شعری نمونوں سے بھی اردو کے ابتدائی نقوش کی صورت میں پیش کیا ہے۔ یہ تاریخ اس لیے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں اختصار کا پہلو انتہائی اہمیت کا حامل ہے، کہیں بھی تشنگی محسوس نہیں ہوتی بلکہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اتنے بڑے موضوع کو انھوں نے اختصار کے ساتھ گویا 'دریا کو کوزے میں بند کر دیا' ہے۔ اس تاریخ کے حوالے سے اس کا املائی نظام اپنے عہد کا مظہر ہے۔ جہاں نون معروف، یائے معروف کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ یہ وہی املا ہے جو غالب کے خطوط میں موجود ہے جس کی قرأت شاید آج کے طالب علم کے لیے آسان نہیں ہے۔

ہندی اور اردو کے حوالے سے آج بھی یہ بحث جاری ہے کہ کس طرح ہندی اور اردو کو الگ کیا جائے۔ اس کی تاریخ بھی طویل ہے۔ ۱۹۳۲ء میں آل انڈیا ریڈیو سے پانچ تقریریں نشر کی گئیں جن میں ڈاکٹر ذاکر حسین، تاراچند، مولوی عبدالحق جیسے اکابرین کی تقریریں بھی شامل تھیں جسے قاسم نوری نے کتابی شکل میں تشکیل دیا۔(۱۳) پھر اسی طرح سے ۲۰۰۳ء میں گیان چند نے "ایک بھاشا دو لکھاوٹ" لکھ کر اس بحث کو دوبارہ سے تر و تازہ کیا جس کے رد میں عبدالستار دلوی جیسے لوگوں نے کتابیں لکھ کر اس مقدمے کو جھٹلانے کی کوشش کی۔ زیرِ نظر تاریخ اس بات کی بھی بخوبی وضاحت کرتی ہے کہ ہندی اور اردو کا آپس میں رشتہ کیا ہے اور دونوں کے درمیان اشتراکات اور بعد ازاں الگ الگ شناخت کیسے موجود ہوئی؟ اس تاریخ نے موضوع بنایا ہے اور بہت مدلل انداز میں اس کی وضاحت کر دی ہے۔

حیرانی کی بات یہ ہے کہ گیان چند جین نے "اردو ادب کی تاریخیں" لکھتے ہوئے اس اہم اور مختصر ترین تاریخ کو کس طرح سے نظر انداز کیا۔ گمان کیا جا سکتا ہے کہ شاید ان کی نظر سے یہ تاریخ نہ گزری ہو، وگرنہ اس تاریخ کی اہمیت اپنے مندرجات کے حوالے سے مسلّم ہے جسے کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

حوالہ جات

۱۔ جمیل الدین عالی، دیباچہ: اردو ادب کی تاریخیں، از گیان چند جین، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۰ء، ص:

۲۔ احتشام حسین، ادبی تاریخ، مشمولا: ادبی تاریخ نویسی، مرتبین: عامر سہیل، نسیم عباس احمر، لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۱۵ء، ص:۱۶

۳۔ گیان چند جین، تحقیق کا فن، لاہور: مشتاق بک کارنر، ۲۰۱۶ء، ص:۵۵۳

۴۔ جومل واعظ لال، بیک فلیپ: اردو زبان کی تاریخ، دہلی: مطبع مجتبائی، ۱۹۲۰ء

۵۔ ایضاً، ص:۱۲

۶۔ ایضاً، ص:۷

۷۔ ایضاً، ص:۲۱

۸۔ ایضاً، ص:۴۲

۹۔ ایضاً، ص:۴۹

۱۰۔ ایضاً، ص:۵۶

۱۱۔ ایضاً، ص:۷۳

۱۲۔ ایضاً، ص:۷۹

۱۳۔ قاسم نوری، مرتب: اُردو، ہندی زبان، لاہور: نوری پبلشرز، ۱۹۶۰ء

References in Roman Script

1. Jameel ud Din Aali, Dibacha: Urdu Adab Ki Tareekhein, az Giyan Chand Jain, Karachi: Anjuman Taraqqi-e-Urdu, 2000, s:2
2. Ihtisham Husain, Adabi Tareekh, Mashmoola: Adabi Tareekh Nawisi, Murattibeen: Aamir Sohail, Naseem Abbas Ahmar, Lahore: Pakistan Writers Cooperative Society, 2015, s:16

3. Giyan Chand Jain, Tehqeeq ka Fun, Lahore: Mushtaq Book Corner, 2016, s:553
4. Jomal Waiz Laal, Back Flip: Urdu Zaban ki Tareekh, Dehli: Matba Mujtabai, 1920
5. Ibid, P:2
6. Ibid, P:7
7. Ibid, P:21
8. Ibid, P:42
9. Ibid, P:49
10. Ibid, P:56
11. Ibid, P:73
12. Ibid, P:79
13. Qasim Noori, Murattib: Urdu, Hindi Zaban, Lahore: Noori Publishers, 1960